محمد بلال

حیات امین احسن

(۶)

باب ۶

مولانا مودودی سے محبت اور بے تکلفی

سابق امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد صاحب، امین احسن کی مولانا مودودی کے ساتھ محبت اور بے تکلفی پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہاں تک مولانا مودودی صاحب کے بارے میں اصلاحی صاحب کے تاثرات و جذبات کا تعلق ہے ان کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مارچ ۱۹۵۳ء کے مارشل لاء کے تحت مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی صاحب سمیت جماعت کے پچاس ساٹھ نمایاں ارکان گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیے گئے۔ مولانا مودودی، مولانا اصلاحی، ملک نصر اللہ خان عزیز، چوہدری محمد اکبر سیالکوٹی، سید نقی علی اور میں (طفیل محمد) لاہور سنٹرل جیل کے دیوانی وارڈ میں نظر بند تھے۔ وہیں مئی ۱۹۵۳ء میں مارشل لاء کے تحت فوجی عدالت میں مولانا مودودی، ملک نصر اللہ خان عزیز اور سید نقی علی صاحب پر مقدمہ چلا اور تین روز کی کارروائی کے بعد مولانا مودودی صاحب کو سزائے موت اور سات سال قید بامشقت اور سید نقی علی صاحب کو نو سال قید بامشقت اور ملک نصر اللہ خان عزیز صاحب کو تین سال قید بامشقت کی سزا سنادی گئی۔ مولانا مودودی کو دیوانی گھر سے پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ پھانسی کی کوٹھڑی میں ان کو پھانسی کے قیدیوں کا لباس پہنا دیا گیا

اور ان کی قمیض، پاجامہ اور جوتا اور ٹوپی وہاں سے ہمارے پاس دیوانی گھر میں بھجوا دیے گئے تو ان چیزوں کو پاتے ہی مولانا اصلاحی صاحب فرط جذبات میں مولانا مودودی صاحب کی ٹوپی اور یہ کپڑے کبھی آنکھوں سے لگاتے، کبھی اپنے سر پر رکھتے اور کبھی سینے سے لگاتے، زار و قطار روتے اور فرماتے جاتے کہ میں مودودی صاحب کو بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا، لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ خدا کا اس قدر مقبول اور مقرب بندہ ہے۔''

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ۹۹-۱۰۰)

جناب جاوید احمد غامدی نے لکھا:

''... مولانا مودودی سے انھیں اتفاق بھی رہا اور اختلاف بھی ہوا۔ اتفاق کے زمانے میں جب بعض علما نے ان کے علم کا استخفاف کرنا چاہا تو امین احسن کی شہادت ایک برہان قاطع بن کر سامنے آئی۔ بعد میں از راہِ تفنن فرمایا کرتے تھے کہ بھائی، وہ میں نے مولویوں کے مقابلے میں ان کے علم کی شہادت دی تھی، اپنے مقابلے میں نہیں۔ کم و بیش ۱۶ سال وہ مولانا کے سب سے زیادہ قابل اعتماد ساتھی رہے۔ ان کے ساتھ ''جماعت'' کی علمی و فکری رہنمائی کا کام بھی کیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی بڑی استقامت کے ساتھ برداشت کیں۔ بتاتے تھے کہ قرآن میں تجزیۂ مطالب اور پیروں کی تقسیم کا کام میں نے ملتان جیل میں مکمل کیا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں مولانا کو موت کی سزا ہوئی تو ان کے جذبات بے پناہ تھے۔ اختلاف کے زمانے میں بھی، جب وہ انھیں اپنے مخصوص اسلوب میں ''امیر المومنین'' کہتے اور ان پر تند و تیز لب و لہجے میں تنقید کر رہے ہوتے تھے، میں نے بارہا ان کے الفاظ کی تلاطم خیزیوں کے نیچے محبت کا ایک گہرا سمندر موجزن دیکھا ہے۔ انھیں افسوس تھا کہ اپنے جس دوست کے بارے میں وہ اتنی اونچی رائے رکھتے تھے، وہ کس دلدل میں اتر گیا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں، میں مولانا مودودی کے گھر کے بالکل سامنے مقیم تھا۔ وہ میرے ہاں تشریف لائے۔ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے لیے صحن میں نکلے تو مجھ سے پوچھا: مولانا مودودی کا گھر یہی ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ میں نے دیکھا کہ وہ بار بار دہرا رہے تھے:

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

۱۸ر جنوری ۱۹۵۸ء کو یہ آشنائی امین احسن کے ان الفاظ پر ختم ہوئی:

''میں جانتا ہوں کہ آپ کی رفاقت سے محروم ہو کر میں کیا کچھ کھو رہا ہوں، لیکن آپ کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر آپ نے مجھ جیسے خیر خواہ مخلص کے مشوروں کی قدر نہیں کی تو آپ کو ''برے مشیروں'' کے مشورے ماننے پڑیں گے۔ میں دل سے متمنی تھا کہ مجھے آپ کی رفاقت حاصل رہے، لیکن آپ نے اپنے دونوں خطوں میں

اس کی جو قیمت مانگی ہے، میں وہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔''

مولانا دنیا سے رخصت ہوئے تو بڑے تاسف کے ساتھ فرمایا: آج وہ شخص دنیا سے چلا گیا جس سے اتفاق میں بھی لذت تھی اور اختلاف میں بھی۔ جس دن یہ سانحہ پیش آیا وہ میرے گھر میں تشریف فرما تھے، مولانا کی بذلہ سنجی کا ذکر ہوا تو پٹھان کوٹ کے زمانۂ قیام کے بعض دل چسپ واقعات سنائے۔ انھی میں ایک یہ لطیفہ بھی تھا۔ کہنے لگے: میری شادی ہوئی، چودھری عبدالرحمٰن صاحب، میرے خسر مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میں کسی وجہ سے اس روز عصر کی نماز میں حاضر نہیں ہو سکا۔ مولانا سے کسی نے پوچھا: امین احسن نظر نہیں آئے؟ انھوں نے برجستہ جواب دیا: بھائی آج صبح سے وہ 'ان الانسان لفی خسر' میں مبتلا ہیں۔ بذلہ سنجی اور شوخیِ کلام میں امین احسن کا معاملہ بھی یہی تھا۔

قید کے زمانے میں مولانا مودودی کی بتیسی غالباً ٹوٹ گئی۔ امین احسن نہیں جانتے تھے کہ مولانا کے دانت مصنوعی ہیں۔ کسی نے بتایا تو دانتوں کی ''تعزیت'' کے لیے مولانا کے پاس گئے۔ بظاہر بہت افسردگی کی کیفیت میں تھوڑی دیر کے لیے کوٹھڑی کے دروازے میں کھڑے ہوئے، پھر کہا: مولانا، افسوس ہے، مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کے کھانے کے دانت اور ہیں اور دکھانے کے اور۔'' (ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ۱۹-۲۱)

۲۳/ جنوری ۱۹۵۸ء کو مولانا مودودی کے نام امین احسن نے خط لکھا:

''مجھے جماعت کی موجودہ پالیسی، اس کے موجودہ نظام اور اس کے موجودہ دستور سے اتفاق نہیں ہے اور بدقسمتی سے آپ پر بھی آپ کے بعض اقدامات کے سبب سے مجھے اعتماد باقی نہیں رہا ہے۔ جماعت کے کچھ مخلصین جو اصلاحِ احوال کی کوشش کر رہے تھے اب وہ بھی اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر مجھے اپنی مایوسی کی اطلاع دے چکے ہیں۔ اس وجہ سے نہایت افسوس کے ساتھ اب میں جماعت کی رکنیت سے استعفیٰ دیتا ہوں۔

اس موقع پر میں یہ ظاہر کرنے میں اطمینان اور خوشی محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس جماعت سے جو محبت رہی ہے ان شاء اللہ بحیثیتِ مجموعی وہ اب بھی قائم رہے گی۔ اس جماعت کے اندر میرے بہترین احباب ہیں جن کے دینی جذبات و احساسات کی میرے دل میں بڑی قدر و عزت ہے۔

آپ سے مجھے کوئی ذاتی رنجش یا شکایت نہیں ہے اور اگر ہے تو میں اس کو صدقِ دل سے معاف کرتا ہوں۔ چودہ پندرہ سال کے تعلق کے دوران میں آپ کو مجھ سے بہت سی تکلیفیں پہنچی ہوں گی میں ان سب کے لئے نہایت ادب سے معافی مانگتا ہوں اور اپنے لئے دعا کی درخواست کرتا ہوں۔ مرکز یا جماعت کے کسی اور رفیق کے لئے میری کوئی بات وجہ شکایت بنی ہو تو میں آپ کے واسطے سے ان سے بھی معافی کی درخواست کرتا

ہوں۔‘‘(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ۵۰)

ممتاز صحافی اور کالم نگار عطاء الرحمٰن نے لکھا:

’’... یہ میرے مشاہدے کی بات ہے کہ ۶/ جنوری ۱۹۵۴ء کو جب جماعت اسلامی خلاف قانون قرار دے دی گئی اور ایوب حکومت نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو گرفتار کر لیا تو اصلاحی صاحب پر بہت دیر تک رقت کا عالم طاری رہا۔ مولانا مودودی پر وہ سخت تنقید بھی کرتے، لیکن جب کبھی ان کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے، ان کے ساتھ گزرے ہوئے اچھے لمحات کو یاد کرتے یا انھیں ’’قلم کا بادشاہ‘‘ کہتے ہوئے ان کی انشا کے محاسن بیان کرتے تو ان پر پرانے دوست اور رفیق کار کی محبت کا رنگ غالب آجاتا۔ حضرت مولانا مودودی کے انتقال پر ان کی جو کیفیت تھی، وہ بھی باوجود تمام تر اختلافات کے اس اخلاص اور محبت کی غمازی کرتی تھی جو انھیں بانی جماعت اسلامی کے ساتھ تھی۔‘‘(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ۴۳)

’’تدبر قرآن‘‘ کی تکمیل پر ریڈیو پاکستان نے ۲۳/ مارچ ۱۹۸۲ء کو لاہور میں امین احسن کا انٹرویو لیا۔ آپ نے جماعت اسلامی سے اپنے استعفیٰ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ:

’’... میں نے کھڑے کھڑے استعفا لکھا اور آخر میں یہ لکھ دیا کہ یہ استعفا واپس لینے کے لیے نہیں بھیجا جا رہا۔ اس کے بعد دوڑ دھوپ ہوئی۔ مولانا مودودی بھی آئے تو میں نے ان سے کہا: مولانا میں نے آپ کو پہچان لیا اور آپ نے مجھے پہچان لیا۔ ’ھذا فراق بینی وبینك‘۔ اب ہم کبھی نہیں ملیں گے۔

سوال: اللہ میاں کے ہاں تو ملیں گے؟

جواب: ہاں وہاں تو خیر ملنا ہی ہے (ہنستے ہوئے)۔

سوال: کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ وہاں بھی ملنے سے انکار کر دیں؟

جواب: میری تو دعا ہے کہ اے میرے رب رفیق اعلیٰ کی معیت اور صحبت نصیب کر۔ اگر مولانا بھی اس میں شامل ہوں گے تو فبھا۔‘‘(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ۱۳۲)

اس کے باوجود امین احسن کو جماعت کے بعض حلقوں کی جانب سے دکھ پہنچایا گیا۔ لاہور سے ۲۳/ مئی ۱۹۵۹ء کو سردار محمد اجمل خان لغاری کے نام خط میں انھوں نے لکھا:

’’مجھے جماعتی حلقوں کی طرف سے بھی بعض خطوط موصول ہوئے ہیں لیکن وہ زیادہ تر گمنام ہیں۔ ان میں میرے دلائل کی قوت کا تو اعتراف کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی مجھے اس جرم میں گالیاں دی گئی ہیں کہ میں نے اس مضمون میں مولانا مودودی صاحب پر ذاتی حملے کئے ہیں چونکہ یہ خطوط گمنام تھے اس وجہ سے میں نے ان کو

کوئی اہمیت نہ دی۔

مرکز کے لوگوں میں سے ایک صاحب نے اپنی اہلیہ کے ذریعہ سے بار بار پیغام بھیج کر میری بیوی کو بلوایا۔ میری اہلیہ اپنی والدہ کی شدید علالت کے باوجود محض اس خیال سے ان کے ہاں چلی گئی کہ شائد کسی خانگی مشکل میں ان کی کسی مدد کی ضرورت ہو لیکن ان صاحب نے میری اہلیہ کے سامنے مجھے خوب خوب صلواتیں سنائیں۔ مرکز کے بعض دوسرے حضرات کا بھی رویہ یہی ہے۔ مجھے اس رویہ پر افسوس تو ضرور ہوا لیکن کوئی تعجب نہیں ہوا، اس لئے کہ میں اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر ان لوگوں سے اس سے بہتر اخلاق کی کوئی توقع نہیں رکھتا تھا۔" (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ۶۵)

۱۷ر نومبر ۱۹۹۰ء کو اپنی ہفتہ وار نشست میں مولانا مودودی سے اپنے تعلقات کی نوعیت واضح کرتے ہوئے امین احسن نے بتایا کہ:

"میرے اور مولانا مودودی صاحب کے تعلقات صد فی صد جماعتی اور علمی رہے ہیں۔ ذاتی بالکل بھی نہیں۔ یہاں تک کہ میں ان کے بچوں میں سے بھی کسی کو واجبی واجبی پہچانتا رہا ہوں۔ کچھ زیادہ نہیں۔ بس جماعت کے معاملات تک اگر کبھی انھوں نے بلایا تو میں چلا گیا۔ اور یہ یاد نہیں کہ میں نے خود اپنے لیے کوئی بات کہنے کے لیے ان سے کہی ہو۔ چاہے وہ مذہبی ہو یا سیاسی۔ کبھی وہ مشورے و شورے کے لیے بلاتے تھے تو چلا جاتا تھا۔"